مذہب اور سائنس

علامہ سید مناظر احسن گیلانی

مذہب کا سنگ بنیاد: ماضی کی تلاش، مستقبل کی فکر، بشری فطرت کی ایک قدرتی بے چینی ہے، جوں جوں انسانی دل و دماغ بلند و بیدار ہوتے جاتے ہیں، ان سوالات کا دائرہ بھی وسیع سے وسیع تر ہوتا جاتا ہے۔ ایک تنگ خیال پست فطرت آدمی صرف اپنی ذات کے ماضی اور مستقبل کو سوچتا ہے، جو اس سے اونچا ہوتا ہے وہ اپنے خاندان کو بھی اس خیال میں شریک کر لیتا ہے۔ اسی طرح جو ان سے بھی عالی طبع ہوتے ہیں وہ نہ صرف خاندان بلکہ قوم و وطن کے متعلق بھی غور کرتے ہیں حتیٰ کہ فطرت انسانی کی بلندی کا ایک نقطہ وہ بھی ہے جہاں ذات و خاندان، قوم و جنس ہی نہیں بلکہ خود اس عالم کے متعلق یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کائنات کا یہ دریائے ناپید کنار جس کے ایک گوشے میں آفتاب و ماہتاب تنکے کی طرح تیر رہے ہیں اور فطرت کا یہ بحر ذخار جس میں ہر آن، ہر لحظہ کروڑوں ہستیاں اُبھرتی اور ڈوبتی رہتی ہیں، آخر اس کا نقطۂ آغاز اور ابتدائی سرچشمہ کیا ہے؟ اور گنبد گردوں کے ان چکروں کا آخری انجام کیا ہوگا؟ انسان جب تک انسان ہے، جب تک اس کے کاسۂ سر میں جانوروں کا مغز نہیں بلکہ انسانی دماغ کی بلندی اور ذہنی وسعت باقی ہے، یہ سوالات بھی باقی رہیں گے اور ان کو باقی رہنا بھی چاہیے کہ اس جستجو کے بغیر انسانی زندگی کا ماضی و مستقبل بجز تاریکی کے اور کچھ نہیں ہے، آخر جس کا ماضی بھی تاریک اور مستقبل بھی اندھیرے میں ہو، کیا وہ کہہ سکتا ہے کہ وہ روشنی میں ہے! کہاں سے آرہا ہے؟ کہاں جارہا ہے؟ جس مسافر کے لیے دونوں باتیں مجہول ہوں اس کے سفر کا انجام معلوم!

ترجمہ: ”کیا جو اوندھے منہ جارہا ہے (نہ آگے کا حال اُسے معلوم نہ پیچھے کا) وہ سیدھی راہ پر ہے یا وہ جو کھڑا سیدھی راہ پر جارہا ہے۔“

خلاصہ یہ ہے کہ گزشتہ اور آئندہ کے متعلق جتنی بلندی سے سوال اٹھایا جائے گا، اسی نسبت سے ہماری فطرت بھی بلند سے بلند تر ہوتی جائے گی، بلکہ سچ پوچھیے تو اسی نسبت سے تاریکی بھی گھٹے گی اور روشنی بڑھے گی۔

بہر حال ہماری فطرت کے یہی دو مطالبے ہیں جو دراصل مذہب کے سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں، لیکن ان کے سوا

اور بھی چند سوالات ہیں جو قریب قریب ان ہی دو سوالوں کی طرح ہماری فطرت کی گہرائیوں سے ابلتے رہتے ہیں اور مذہب کی تعبیر میں اُن کو بھی بہت کچھ دخل ہے۔ اب ہم ترتیب کے ساتھ چند اہم سوالات کو ذیل میں بیان کرتے ہیں:

بنیادی سوالات:

۱۔ عالم کا نقطۂ آغاز کیا ہے؟

۲۔ اس کا آخری انجام کیا ہوگا؟

۳۔ ہر چیز کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ انسان کے کام آئے، پھر انسانی وجود کا کیا مقصد ہے؟

۴۔ کیا زندگی کی موجودہ کش مکش سے نجات کی کوئی صورت نکل سکتی ہے؟

۵۔ کیا بقائے دوام کی فطری خواہش مغالطی اور وہمی طور پر نہیں بلکہ حقیقی معنوں میں پوری ہو سکتی ہے؟

۶۔ علمی اور عملی طور پر ہم میں سے ہر شخص غیر محدود ہونے کی خواہش رکھتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ جو چاہوں کروں اور جو کچھ چاہوں جانوں، کیا فطرت انسانی کا یہ مطالبہ اپنے مقصد کو پا سکتا ہے؟

یہی سوالات ہیں جن کے جواب کا نام مذہب ہے، یہی پیاس ہے جس کے پانے کی تعبیر دین سے کی جاتی ہے، یہی وہ بھوک ہے جس کی غذا صرف پیغمبروں کا پیغام ہے اور انہی سوالات کو حل کرنا مذہب کی اصل غرض و غایت ہے۔

مذہبی سوالات اور علوم عقلیہ: مذہب نے ان سوالات کو جن ذرائع سے حل کیا ہے اس کے بتانے سے پیشتر یہ دیکھنا چاہیے کہ مذہب سے کنارہ کش ہو کر کیا صرف عقلی علوم کی رہنمائی میں ہم ان سوالوں کو حل کر سکتے ہیں؟ بحث کے لیے صرف اس سوال کو لو کہ: عالم کا نقطۂ آغاز اور انجام کیا ہے؟ کیوں کہ اس کے حل ہو جانے کے بعد تقریباً دوسرے سوالات خود بخود حل ہو جاتے ہیں، اب آؤ اور عقلی علوم کی روشنی میں ان کا جواب ڈھونڈو۔

یوں تو عقلی علوم کی بہت سی شاخیں ہیں لیکن اجمالی طور پر ان کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک کا نام سائنس ہے اور دوسرے کو فلسفہ کہتے ہیں۔ پہلے ہم سائنس کو لیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اس معاملہ میں وہ ہماری کس حد تک مدد کر سکتی ہے؟

مذہبی سوالات اور سائنس کی حد پرواز: مذہب کے اس بنیادی سوال کو سائنس حل کر سکتی ہے یا نہیں؟ اس کے لیے ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ سائنس کی حد پرواز کیا ہے؟ علماء سائنس نے اس علم کے حدود کو معین کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے اُس کا خلاصہ یہ ہے:

سائنس کی بحث و تحقیق کا تعلق تمام تر فطرت (Nature) کے اُن واقعات اور مشاہدات سے ہے جو ہمارے زیر تجربہ آسکیں لیکن جو چیزیں ہمارے احساس اور مشاہدہ کے دائرہ سے خارج ہیں، سائنس کو ان کے اقرار و انکار سے کچھ بحث نہیں۔

ماہرین سائنس کا اعتراف: پروفیسر لیتر جو فرانس کا مشہور ماہر سائنس ہے لکھتا ہے: ”کائنات کے آغاز و انجام تک

مشاہدے کی رسائی نہیں ہے، اس لیے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ کسی ازلی یا ابدی وجود کا انکار کریں جس طرح ہمارا کام یہ بھی نہیں ہے کہ ہم اس کو ثابت کریں، ہمارا کام نفی واثبات دونوں سے الگ رہتا ہے۔"

پروفیسر ٹنڈل نے اس خیال کو ایک مثال سے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اگر تم گھڑی کو دیکھو، اُس میں گھنٹے، منٹ، سیکنڈ کی سوئیاں نظر آئیں گی، یہ سوئیاں کیوں پھرتی ہیں؟ اور اُن کی حرکت کی باہمی نسبت جو ہمیں نظر آتی ہے کیونکر قائم ہے؟ ان سوالات کا جواب گھڑی کے کھولے اور اُس کے مختلف پرزوں کو اچھی طرح دیکھے اور اُن کا ایک دوسرے سے تعلق قائم کیے بغیر نہیں دیا جاسکتا ہے، جب یہ سب کچھ ہولیتا ہے تب ہم کو یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ سوئیوں کی یہ خاص حرکت گھڑی کی اندرونی ساخت اور مشین کا نتیجہ ہے جو کوک کی قوت سے چل رہی ہے، سوئیوں کی یہ حرکت صنعت انسانی کا ایک کارنامہ ہے لیکن بجنسہ یہی حال واقعات وحوادث فطرت کا ہے۔ عالم کی اس مشین کے اندر بھی ایک مخفی مشین کارفرما ہے اور ایک خزانۂ قدرت ہے جو اِس مشین کو چلا رہا ہے۔ سائنس کا انتہائی کام اس مشین اور ذخیرہ قوت سے پردہ ہٹا کر یہ بتانا ہے کہ واقعات وحوادث ان ہی دونوں کے باہمی تعلق کا نتیجہ ہیں لیکن کارخانۂ عالم کی یہ اندرونی مشین خود کیا ہے؟ اور کیسے بنی؟ اور اس گھڑی کو کس نے کوک دی؟ اور اُس کی چلانے والی قوت کہاں سے آئی؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کا جواب سائنس کے بس سے باہر ہے۔

انسان صرف کچھ جان سکتا ہے، کسی چیز کی تحقیق وایجاد پر قادر نہیں: خلاصہ یہ ہے کہ سائنس نہ تو قدرتی قوانین کو ایجاد کرتی ہے، نہ اُن قوانین کی تمام کڑیوں کو سلجھا کر ہمارے سامنے پیش کرسکتی ہے بلکہ حوادث وواقعات کے محض اُن حلقوں کو ترتیب کے ساتھ ہمیں بتانے کی کوشش کرتی ہے جو اُس کے دائرہ احساس ومشاہدے میں آجاتے ہیں، مثلاً وہ آگ میں جلانے کی خاصیت پیدا نہیں کرتی بلکہ صرف یہ بتاتی ہے کہ تجربہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آگ جلاتی ہے اور اسٹیم کو ایجاد (وجود بخشا اور تخلیق کرنا) نہیں کرتی بلکہ صرف اس حقیقت سے پردہ اٹھا دیتی ہے کہ جب آگ کا تعلق پانی سے ہوتا ہے تو یہ ایک قدرتی قانون ہے کہ وہ بھاپ بن جائے۔ بہرحال ہمارے سامنے جو کچھ قدرتی قوانین پھیلے ہوئے ہیں ہم ان کو بنا نہیں سکتے بلکہ صرف جان سکتے ہیں اور سائنس اس پر اتنا اضافہ اور کرتی ہے کہ اسی حد تک جان سکتی ہے جس حد تک مشاہدہ ہمارا ساتھ دے گا۔ لیکن یہ سوال کہ ان قوانین کا مقنن کون ہے؟ اُن کا نقطۂ آغاز کیا ہے؟ اور ان کا آخری انجام کیا ہوگا؟ سائنس کے حدود سے اِن کا جواب خارج ہے۔

ہکسلے نے سائنس کی اسی درماندگی کا اندازہ کرنے کے بعد بالکل سچ لکھا ہے کہ وہ کسی چیز کی بھی کامل توجیہ نہیں کرسکتی، اس کے سارے اسباب اول سے آخر تک نہیں بتائے جاسکتے کیونکہ انسان کا اعلیٰ سے اعلیٰ علم بھی توجیہ میں آغاز اشیاء کی جانب چند قدم سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔

حکیم اور عامی میں فرق: بہرحال انسان کی انتہائی پرواز سائنس کے نقطۂ نظر سے صرف اس قدر ہے کہ کل نہیں بلکہ

فطرت کے صرف اُن قوانین کو وہ جان سکتا ہے جو حواس کی گرفت میں آجائیں، باقی رہا یہ سوال کہ جب صرف محسوس قوانین کی واقفیت تک عام انسانی پرواز ختم ہوجاتی ہے تو حکیم اور عامی میں کیا فرق رہا؟ تو بات یہ ہے کہ گو عامی کا علم بھی مشاہدات اور محسوسات ہی تک محدود رہتا ہے اور حکیم بھی اس دائرہ سے آگے قدم نہیں رکھ سکتا ہے، لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ عامی آدمی کسی حادثہ یا مظہر قدرت کو جب دیکھتا ہے تو وہ اس کے اثرات کو دور تک نہیں لے جاسکتا، یعنی ایک جزوی واقعہ سے کلیہ نہیں بنا سکتا اور حکیم ایک جزوی واقعہ کو دیکھ کر چونکتا ہے اور یہ دیکھنا شروع کرتا ہے کہ آیا یہ واقعہ اسی جزئیہ تک محدود ہے یا آگے بھی بڑھ سکتا ہے؟ پس اگر اس میں کچھ وسعت نظر آتی ہے تو چند جزئیات پر منطبق کرنے کے بعد اسی جزئیہ کو وہ کلیہ کی شکل عطا کرتا ہے اور اسی کو قانون کے نام سے موسوم کرتا ہے، مثلاً نیوٹن نے سیب کو گرتے ہوئے دیکھا، اس طرح ہر شخص دیکھتا ہے لیکن وہ چونکا کہ آخر یوں گرتا ہے اس کو محسوس ہوا کہ زمین کی کشش کا نتیجہ ہے، اب اس کشش کی خاصیت کو اس نے دوسری چیزوں میں ڈھونڈھنا شروع کیا بالآخر اُس نے اعلان کیا کہ فضا میں جتنے کرّے تیر رہے ہیں وہ سب جذب و کشش ہی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں، بہرحال نیوٹن نے فضائی کرّوں کی خاصیت کا ایک علم حاصل کیا، لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ وہ ان کرّوں کا موجد تھا یا اس نے اُن میں جذب و کشش کی خاصیت پیدا کردی تھی، جو قانون پہلے سے موجود تھا صرف اس کا علم اُس نے حاصل کیا اس سے زیادہ نہ اُس نے کچھ کیا نہ کرسکتا تھا، وہ خود کہتا ہے: ''عالم فطرت کی یہ نیرنگیاں (جذب و کشش) واجب الوجود کے ارادہ کے سوا اور کسی شے سے ظاہر نہیں ہوسکتیں، وہ واجب الوجود جو ہر جگہ اور ہمیشہ موجود ہے۔'' اور یہی حاصل سائنس کے تمام مسائل اور اختراعات کا ہے۔ بھاپ۔ کیتلی کے ڈھکنے کو اٹھتے ہوئے سب ہی دیکھتے ہیں جس طرح اسٹیفن نے دیکھا لیکن اسٹیفن نے اس جزوی مشاہدہ سے ایک کلیہ پیدا کیا اور اس کلیہ کو فطرت کے دوسرے قوانین مثلاً لوہے کی لچک، پہیوں کی گردش، اسی قسم کے میکانکی قوانین کے علم کے ساتھ وابستہ کردیا اُس نے اپنے کسی پیدا کردہ قانون کو نہیں بلکہ قدرتی قوانین کو اس شکل میں نمایاں کیا ہے جسے ہم ٹرین کہتے ہیں۔

الغرض صنعت و حرفت والے قدرتی قوانین کے جزئیات سے کلیات کا علم حاصل کرتے ہیں لیکن کسی چیز کی ایجاد (یعنی اس کو وجود بخشنا) ایک غریب انسان کے بس کی بات نہیں وہ فقط ''**علم آدم الاسماء کلھا**'' (سکھائے اللہ نے آدم کو سارے اسماء) کے اجمال کی تفصیل کرسکتا ہے، یہی اسے دیا بھی گیا ہے اور قرآن نے اسی تسخیر کائنات سے تعبیر کیا ہے۔

سائنس اور مذہب کے حدود: الحاصل جب سائنس کا سارا زور مشاہدات اور محسوسات پر ختم ہوجاتا ہے تو خود اندازہ کرو کہ جن سوالات پر مذہب کی بنیاد قائم ہے مثلاً عالم کا نقطۂ آغاز کیا ہے جیسا کہ ہکسلے نے کہا تھا کہ سائنس کا قدم آغاز اشیا کی جانب چند قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا، تو پھر آخری نقطہ تک اس کی رسائی کیوں کر ہوسکتی ہے۔ پس سچ یہ ہے کہ

سائنس جہاں اپنی تحقیقات ختم کر دیتا ہے، مذہب وہیں سے اپنا درس شروع کرتا ہے، سائنس صرف عالم شہادت (عالم محسوسات) کے چند واقعات محسوسہ کو کلیات کی شکل میں پیش کر کے اپنے بازو ڈال دیتی ہے، محسوسات کے آگے قدم رکھتے ہی اُس پر رعشہ طاری ہو جاتا ہے۔ وہ کچھ نہیں کہہ سکتی کہ آگے کیا ہے اور مذہب انسان کا یہیں سے ہاتھ پکڑتا ہے اور غیب (عالم غیر محسوس) کے سارے اسرار کو اس کے سامنے بے نقاب کرتا چلا جاتا ہے، سائنس کچھ نہیں بتا سکتی کہ دنیا کی ابتدا کیوں کر ہوئی، مذہب آتا ہے اور اس حقیقت سے پردہ اٹھا دیتا ہے۔ انسان مرنے کے بعد کہاں جاتا ہے اور اس پر کیا گزرتی ہے؟ سائنس اس کے جواب سے عاجز ہے اور مذہب اس کی تفصیل پیش کرتا ہے۔ دنیا کا آخری انجام کیا ہوگا؟ سائنس متحیر ہے کہ اس کا کیا جواب دے۔ مذہب آتا ہے اور اس حیرت کو مٹا دیتا ہے۔ سائنس یہ تو بتاتی ہے کہ عالم کس کے لیے ہے، لیکن خود انسان کس کے لیے ہے اس مقصد کو متعین کرنے سے یہ عاجز ہے۔ مذہب آتا ہے اور اس مسئلہ کو بھی صاف کر دیتا ہے۔ الغرض مذہب کا جس عالم سے تعلق ہے سائنس کی ہدایت کا چراغ اس کے حدود تک پہنچتے ہی گل ہو جاتا ہے، میلن ایڈورڈ کہتا ہے اور سچ کہتا ہے کہ عالم کے ان قوانین کی نسبت یہ کہنا کہ یہ محض بخت واتفاق کے نتائج ہیں، یہ فرضی احتمالات اور عقلی گمراہیاں ہیں جسے لوگوں نے محسوسات کا لقب دے رکھا ہے۔ فزیکل سائنس جاننے والا ہرگز اس قسم کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ (بحوالہ الکلام از مولانا شبلی)

اس کے بعد عوام الناس کا یہ خیال کہ سائنس کی جدید تحقیقات نے مذہب کی بنیادیں ہی ہلا دی ہیں، جیسا کہ گنیز و نے غایت گستاخی کے ساتھ لکھا ہے کہ ہم نے خدا کی عارضی خدمات کا شکریہ ادا کر کے اس کو سرحد پار پہنچا دیا۔ (نعوذ باللہ تعالیٰ شانہ) کس درجہ جاہلانہ اور مضحکہ خیز ہے کسی نے خوب کہا ہے کہ ''اگر خشکی کی ٹرین سمندر کے جہاز سے ٹکرا سکتی ہے تو سائنس بھی مذہب سے ٹکرا سکتی ہے۔'' مطلب یہ ہے کہ جب دونوں کے حدود جدا جدا ہیں، ایک کی تگ و دو محسوسات کے تنگ دائرہ تک محدود ہے اور دوسرا، فضا کا شہباز ہے تو ان دونوں میں تصادم کا کیا مطلب ہو سکتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ سائنس اور مذہب بالکل دو جداگانہ چیزیں ہیں، نہ ان دونوں میں اختلاف ہے اور نہ ہو سکتا ہے، ہم سائنس کے ذریعہ آسمان کے تاروں کو گن سکتے ہیں آفتاب کو ناپ سکتے ہیں، ہوا کو تول سکتے ہیں، سمندر کو خشک کر کے بادل بنا کر پانی برسا سکتے ہیں بلکہ ممکن ہے کہ آئندہ مردوں کو زندہ کرنے کی تدبیر بھی معلوم ہو جائے جیسا کہ حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ''احیاء موتی'' (مردے کو زندہ کر دینے) پر بھی آدمی قادر ہو جائے گا بلکہ زندہ کرے گا، دوسرے لفظوں میں اس کو یوں بھی ادا کر سکتے ہیں کہ: ''انسان زندگی کے قانون سے بھی واقف ہو جائے گا'' اور سائنسدانوں کا بھی بیان ہے کہ ہم نے ''تخم حیات'' (پروٹو پلازم) کا پتہ چلا لیا ہے، کیمیا والے کہتے ہیں کہ تخم حیات کاربن، آکسیجن، نائٹروجن کی باہمی ترکیب سے تیار ہوتا ہے۔ تو سائنس یہ سب کچھ کر سکتی ہے اور ہم منتظر ہیں کہ وہ ایسا کرے کیونکہ ہمارے بہت سے ایمانی دعووں کی توثیق انھیں انکشافات پر موقوف ہے لیکن با ایں ہمہ مذہبی سوالات کے حل میں سائنس اس طرح عاجز

رہے گی جس طرح پہلے تھی اور اس وقت تک ہے۔ فرض کیجئے کہ کیمیائی عناصر کی ترکیب سے ہم نے زندگی کو پیدا بھی کر لیا تو اس سے یہ مسئلہ کہاں حل ہوا کہ ان عناصر کی ترکیب سے زندگی کیوں پیدا ہو جاتی ہے؟ اس کی مثال ایسی ہے کہ زندگی کا راز کسی زمانے میں یوں حل کیا گیا تھا کہ نر اور مادہ کے باہمی اختلاط کا یہ نتیجہ ہے، لیکن اُس وقت بھی یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ اس اختلاط سے یہ نتیجہ کیوں نکلتا ہے؟ اب یہ سوال اسی طرح باقی رہے گا کہ کاربن ڈائی آکسائڈ، آکسیجن اور ہائیڈروجن کی باہمی ترکیب سے زندگی کیوں پیدا ہو جاتی ہے؟ جو شخص اس سے واقف ہے کہ تخم کو مٹی میں ملانے اور پانی دینے سے پودا پیدا ہو جاتا ہے، کیا اس نے سوال کو حل کر لیا کہ پودا کیوں کر پیدا ہوتا ہے؟ پروفیسر ٹنڈل نے بلفاسٹ کے لکچر میں ایک موقع پر کتنی اچھی بات کی کہ لیکن کیوں؟ اس کا جواب ہمیشہ کے لیے اسی طرح ناممکن رہے گا جس طرح کہ پہلے رہا ہے۔ امجد حیدر آبادی نے بھی اس مضمون کو ایک شعر میں ادا کیا ہے ؎

امجد ہر بات میں کہاں تک کیوں کیوں
ہر کیوں کی ہے انتہا خدا کی مرضی

الحاصل کسی شے کے آغاز کا پتہ چلانا اور اس کے آخری انجام تک پہنچنا سائنس کی رہنمائی میں ناممکن ہے، چند قدم چل کر اس کو اپنی نارسائی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے، علی الخصوص جب حواس اس کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں اور یہی حال انجام کا ہے کہ آئندہ کیا ہوگا، موجودہ قوانین کا آئندہ کیا حال ہوگا، ان کے آثار ونتائج کیا ہوں گے؟ اس کا بھی کوئی قطعی جواب سائنس نہیں دے سکتی۔ وہی ہکسلے جس نے آغاز کے متعلق انسان کے جاہل ہونے کا اقرار کیا تھا اب انجام کے متعلق بھی اسی اعتراف کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے: ”عالم تو بڑی چیز ہے سائنس کا معمولی قانون یہ ہے کہ جو پتھر بے سہارا ہوگا اس کو زمین پر گر پڑنا چاہیے لیکن ہمیشہ کیا یہی ضرور ہوگا۔“

اس کے نزدیک یہ قانون قدرت نہیں بلکہ انسان کا وہمی اضافہ ہے اُس کے اپنے الفاظ یہ ہیں۔ ”وہ ڈراؤنا لزوم اور ضروری ہونے کا قانون کیا ہے؟ جس نے لوگوں کو اس قدر خائف اور وحشت زدہ بنا رکھا ہے، سچ پوچھو تو یہ ہمارے واہمہ کا ایک گھڑا ہوا بھوت ہے، سائنس ہی کا یہ قانون ہے کہ پتھر جب بے سہارا ہوگا تو اس کو زمین پر گر پڑنا چاہیے لیکن آئندہ وہ ہمیشہ گر ہی پڑے گا یعنی اس کے خلاف ہونا ناممکن ہے، یہ ایک ایسی زائد شے کا اضافہ ہے جس کا نہ تو مشاہدہ اور واقعات میں نشان ملتا ہے اور نہ کہیں اس سے پتہ چلتا ہے۔“ (ماخوذ از فزیکل سائنس آف لائف) یعنی یہ ایسا حکم ہے جس کی شہادت ہمارے حواس نہیں دیتے۔

سائنس کی یہ رائے تو انجام کے متعلق تھی۔ رہا آغاز اس کے متعلق میں نے چند اقوال پہلے بھی درج کیے ہیں لیکن آخر میں ہکسلے ہی کے قول کو پیش کر کے اس بحث کو ختم کرتا ہوں۔ وہ اپنی کتاب ”اصول ونتائج“ میں لکھتا ہے: ”وجود کی علت اولیٰ کا مسئلہ میرے حقیر قویٰ کی دسترس سے باہر ہے جتنی لایعنی ہرزہ سرائیوں کے پڑھنے کا مجھے موقع ملا ان میں سب سے بدتر ان لوگوں کے دلائل ہوتے ہیں جو آغاز عالم کے متعلق موشگافیاں کرتے ہیں مگر ان لوگوں کے مہملات ان سے بھی زیادہ بڑھ جاتے

ہ جو یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ کوئی خدا نہیں ہے۔"

مذہبی سوالات اور فلسفہ: مذہب جن سوالات کو حل کرتا ہے میں نے بتایا ہے کہ ان میں اہم ترین سوال عالم کے آغاز وانجام ہی کا تھا، باقی سوالات انھیں دو سوالوں کی ذیلی اور تفصیلی شکلیں ہیں، سائنس تو یہ کہہ کر اکھاڑے سے نکل گئی کہ ان سوالات کا تعلق غیب سے ہے اور ہماری بحث کا دائرہ چونکہ صرف محسوس قوانین تک محدود ہے، اس لیے غیر محسوس قوانین کے سوالوں کے جواب ہمارے فرائض میں داخل نہیں۔ اب فلسفہ کی اونچی دکانیں سامنے آتی ہیں۔ آؤ! ذرا ان کی بھی سیر کرلیں۔ سنا جاتا ہے کہ اس علم میں محسوسات کی چار دیواریوں کو پھاند کر، محسوس قوانین کے دائرہ سے نکل کر ان امور کا بھی پتہ چلایا جاتا ہے، جو مشاہدہ اور تجربہ کی گرفت سے باہر ہیں اور یہ ایک حد تک صحیح بھی ہے، فلسفہ کے شعبہ مابعد الطبعیات (فزکس) والوں نے ان سوالات کو بھی چھیڑا ہے جن کی گرہ کشائی کا محض مذہب حق دار تھا اور یہی وجہ ہے کہ دنیا کے کسی علم سے اگر مذہب کی ٹکر ہو بھی جاتی ہے تو وہ محض فلسفہ ہے، بلکہ فلسفہ کی صرف ایک شاخ مابعد الطبعیات ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ تاریخ، ریاضی، ہندسہ، کیمیا، طب اور دیگر میکانکی علوم یا صنائع نے نہ کبھی مذہب کے میدان میں قدم رکھا اور نہ کبھی اُن سے مذہب کو اختلاف ہوا، صرف فلسفہ ہی ایک ایسا علم ہے جس میں غیبی حقائق اور مذہبی امور کو عقلی گرفت میں لانے کی کوشش کی جاتی ہے اور اس کوشش میں کبھی کبھی وہ مذہب سے متصادم ہوجاتا ہے، یہی معمولی تصادم ہے جس کی بنیاد پر اس زمانہ میں ہنگامہ برپا کردیا گیا کہ علم نے مذہب کی بنیادیں ہلادیں، حالاں کہ میں بتاچکا ہوں کہ اگر 'علم' سے مراد مابعد الطبعیات کے سوا کوئی اور علم ہے، تو اس سے زیادہ بے بنیاد، گندہ اور فریبہ جھوٹ ممکن نہیں اور اگر صرف مابعد الطبعیات مراد ہے تو اس میں شبہ نہیں کہ یہ ایک حد تک درست ہے لیکن فلسفہ کے نادان مرید اپنے پیروؤں کو جتنی بلندی پر لے جاکر اڑانا چاہتے ہیں واقعات بتائیں گے کہ وہ قطعاً اس کے مستحق نہ تھے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ مابعد الطبعیات میں جن امور کے متعلق رائے قائم کی جاتی ہے چونکہ اُن کا تعلق مشاہدات اور تجربات سے نہیں ہوتا اس لیے کچھ قیاسات اور تخمینے، ظنون اور اندازے ہوتے ہیں جن کے بل پر رائے قائم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے اور یہی ہونا بھی چاہیے کہ ان رایوں میں اختلاف اور شدید اختلاف پیدا ہوجائے، ہر شخص اپنی دماغی خصوصیت، موروثی اثرات اور ماحول کے غیر شعوری تاثرات کے تحت ایک تجویز پیش کرتا ہے جو دوسرے سوچنے والوں سے بالکل مختلف ہوتی ہے، اس کا صحیح اندازہ فلسفہ کی تاریخ پڑھنے سے ہوتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چند اندھے ہیں جو آنکھ سے ہاتھی کو دیکھ نہیں سکتے اور صرف چھو کر اس کی شکل وصورت کے متعلق رائے قائم کررہے ہیں۔ ہر ایک نئی مثالوں اور جدید تشریحوں کے قالب میں اپنے نتائج کو ڈھال کر پیش کررہا ہے۔ بہر حال یہ آپس میں جتنا چاہیں الجھیں مجھے اس سے کیا بحث۔ میں تو صرف یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ فلسفہ اور مذہب کے اختلاف کا بظاہر اس زمانہ میں بڑا ڈنکا پیٹا جارہا ہے۔ دیکھیں تو سہی اس طبل بلند بانگ کے اندر بھی کچھ ہے یا نہیں؟ ______ ☆☆